© rasailojaraid.com

پروفیسر خالد شبیر احمد قسط: ۲۷

ورق ورق زندگی

پرنسپل صاحب سے آخری ملاقات:

میں دفتر میں گیا تو پرنسپل صاحب اکیلے اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مجھے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور فرمانے لگے:

''دیکھو میں نے ایک سال تمہارے ساتھ گزارا ہے۔ تم ٹیچر تو بڑے اچھے ہو اور اکثر میں تمہارا لیکچر یہاں اپنے دفتر میں بیٹھ کر سنتا رہتا ہوں۔ لیکن تمہاری عادات ٹھیک نہیں ہیں۔ تم اپنی عادات کو تبدیل کر لو۔ ورنہ تمہارا یہاں پر ملازمت کرنا مشکل ہوگا۔''

میں نے جواباً عرض کیا:

''جناب پرنسپل صاحب! جن عادات کی تبدیلی کے بارے میں آپ ارشاد فرما رہے ہیں یہ تو میں نے بڑی محنت کر کے اپنائی ہیں۔ میں بھلا انہیں آپ کو راضی کرنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

پرنسپل صاحب نے جواب میں کہا:

''نہیں تم ابھی جوان ہو، تم نے عمر گزارنی ہے اگر تم نے ان عادات کو نہ چھوڑا تو آئندہ آنے والی زندگی میں تمہارے لیے یہ مشکلات کا باعث بنیں گی۔''

میں نے کہا کہ:

''آپ میری آنے والی زندگی کے بارے میں زیادہ فکرمند نہ ہوں، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیں۔''

کہنے لگے:

''میں آپ کو چودہ دن کی مہلت دیتا ہوں، گھر جا کر ایک معذرت نامہ لکھیں اور مجھے یقین دلائیں کہ آپ جو کچھ اس ایک سال میں کرتے رہے ہیں آئندہ نہیں کریں گے۔ ورنہ پندرھویں روز آپ کو ملازمت سے برطرف ہونے کا حکم نامہ مل جائے گا۔''

میں نے جواب میں کہا:

''آپ یہ چودہ دن خواہ مخواہ انتظار میں رہیں گے، میں نے نہ کوئی غلط کام کیا ہے اور نہ ہی معذرت نامہ لکھوں گا۔ آپ مجھے اسی وقت فارغ کر دیں۔''

کہنے لگے: ''آپ مستعفی ہو جائیں۔''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے کہا کہ ''میں کیوں مستعفی ہوں میں تو کام کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور پھر وہی الفاظ دہرائے کہ چودہ دن کے انتظار کے بعد آپ کو ملازمت سے برطرفی کا لیٹر مل جائے گا۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ میں چلا آیا اور تمام دوست جو میرا انتظار کر رہے تھے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

گرمی کی چھٹیاں تھیں میں گھر آ گیا۔ اور عین پندرہویں دن مجھے ملازمت سے برطرفی کا لیٹر موصول ہو گیا۔ اس کے بعد جب فرسٹ ائیر کا نتیجہ آیا تو میرا نتیجہ سو فیصد رہا۔ اس پر انجمن نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ ایک آدمی جو پہلے سال ہی اپنا نتیجہ سو فیصد تک لے گیا اسے کیوں برطرف کیا گیا۔ اسے دوبارہ بلایا جائے۔ ہیڈ کلرک نے میرے گھر مجھ سے اس سلسلے میں ملاقات کی اور کہا کہ کالج والے دوبارہ آپ کو نوکری پر بلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے جب چھوڑ دیا تو چھوڑ دیا۔ اللہ رزّاق ہے۔ محنت جو ٹھہری ہے تو کر لیں گے کہیں اور۔ اس طرح میرا اور چک ۳۳ گ۔ب کا عارضی رشتہ منقطع ہو گیا۔ جو پھر کبھی نہ جڑ سکا۔ لیکن مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں نے کوئی غلط فیصلہ کیا۔ بعد میں آنے والے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس وقت میرا یہ فیصلہ صحیح اور درست فیصلہ تھا۔ ورنہ میں شاید اُسی کالج کے اندر اسی طرح سر ٹکراتا رہتا جس طرح ایک سال تک ٹکراتا رہا۔ ہر کام میں اللہ کی حکمت ہوتی ہے اور جو وہ چاہتا ہے وہی بندے کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ زندگی میں پہلی نوکری ختم ہو گئی۔ اب دوسری نوکری کی تلاش شروع ہوئی۔ جس کے لیے روزانہ ''پاکستان ٹائمز'' کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ یہی ایک ذریعہ تھا کہ کہیں کسی کالج میں لیکچرر کی ضرورت ہو تو وہاں پر انٹرویو کے لیے جایا جائے۔ ایک دن میں نے پاکستان ٹائمز میں ایک عجیب و غریب نوکری کے بارے میں پڑھا۔ کہ ''کشمور'' میں کے جی انگلش سکول کے لیے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔ بچوں کا سکول ہے اور ٹیچر کی تنخواہ لیکچرر کے برابر ہو گی یعنی 298=48+250 روپے، دوسری عجیب بات یہ تھی کہ انٹرویو کے لیے روہڑی جنکشن بلایا گیا تھا۔ اور تیسری عجیب بات یہ تھی کہ یہ بھی کہا گیا کہ آنے جانے کا کرایہ بھی دیا جائے گا۔ اُن دنوں میرے بچپن کے دوست مشتاق نسیم دہرہ جو کراچی میں رہتے تھے اور چنیوٹ آئے ہوئے وہ میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ جب میں نے ''پاکستان ٹائمز'' میں یہ پڑھا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ یار یہ کشمور کہاں ہے۔ ہم نے تو صرف کشمیر کا نام ہی سن رکھا ہے یہ کشمور کا نام تو میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ہی سنا ہے۔ وہ جانتا تھا کہنے لگا یہ تو یہاں سے بہت دور سندھ کا بہت بڑا قصبہ ہے۔ جس پر سندھ کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ اور بلوچستان کا صوبہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ تو میں یہ سن کر پریشان سا ہو گیا کہ اتنی دور کون جائے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ انٹرویو کے لیے تو انہوں نے روہڑی ریلوے جنکشن بلایا ہے اور پھر آنے جانے کا کرایہ بھی ملے گا تو انٹرویو دینے میں کیا قباحت ہے۔ انٹرویو دینے تو جانا چاہیے چنانچہ میں اس مقرر دن کے لیے رخت سفر باندھ کر تیار ہو گیا اور انٹرویو دینے والے دن ہمیں روہڑی جنکشن کے ایک خوبصورت کمرے میں بٹھایا گیا۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے اُمیدوار وہاں پر موجود تھے۔ میری باری آئی اور انٹرویو ہو گیا۔ کہا گیا کہ انٹرویو سے فارغ ہونے والے امیدوار انتظار کریں۔ جب سب کا انٹرویو ہو گیا تو پھر ہمیں آنے جانے کا کرایہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دے دیا گیا اور ساتھ ہی کہا گیا کہ ابھی ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ کس امیدوار کو ہم نے نوکری کے لیے رکھنا ہے۔ اس کی اطلاع آپ کو بعد میں دی جائے گی۔ ہم سب کے گھر کے پتے انہوں نے نوٹ کر لیے اور ہمیں کہا گیا کہ آپ تشریف لے جائیں۔ اطلاع بعد میں آپ کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ میں بھی واپس آ گیا۔ اس وقت تک میرے دوست مشتاق نسیم دہرہ چنیوٹ میں ہی تھے انہوں نے پوچھا کہ انٹرویو کیسا رہا میں نے کہا کہ انٹرویو تو اچھا رہا لیکن نوکری کے لیے بعد میں کوئی اطلاع آئے گی۔

بہر حال یہ بھی بڑی حیران کن بات تھی کہ ایک ہفتہ کے ہی بعد ایک ٹیلی گرام میرے نام آئی جس میں یہ پیغام تھا کہ ہم نے آپ کو کے۔ جی انگلش سکول کے لیے بطور پرنسپل منتخب کر لیا ہے۔ آپ ایک ہفتے کے اندر کشمور کالونی نمبر 1 جہاں پر یہ سکول ہے وہاں پہنچ کر اپنی نوکری کے لیے رپورٹ کریں۔ اب تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیا۔ بلایا ٹیچر کے لیے تھا۔ دے دی گئی ہے پرنسپل شپ اور پھر یہ تو مجھے پتہ ہی نہیں ہے کہ کشمور ہے کہاں اور کس طرح وہاں جانا ہے۔ اس پر میں نے اپنے دوست سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ بیکاری سے تو یہ دوری زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے۔ اب تو بھابھی کے ساتھ تمہارا ایک لڑکا بھی ہے تمہیں وہاں جا کر نوکری کرنی چاہیے لیکن میں نے کہا کہ میں وہاں کیسے جاؤں گا مجھے تو اس جگہ کا سرے سے علم ہی نہیں، اس نے کہا کہ میں خود تمہیں چھوڑنے وہاں جاؤں گا اور تمہیں کشمور چھوڑ کر میں وہیں سے واپس کراچی چلا جاؤں گا۔ میں یہ سفر کی تکلیف تمہاری دوستی کی نذر کرتا ہوں تم اس سفر کے لیے اپنا ذہن تیار کر لو۔ اب میرے پاس کشمور نہ جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کشمور جاؤں گا۔

کشمور روانگی:

چنانچہ ہم دونوں چنیوٹ سے لائل پور آئے اور بذریعہ ٹرین روہڑی پہنچے وہاں سے ہم نے ایک دوسری گاڑی پکڑی جو ہم دونوں کو شکارپور لے آئی۔ شکارپور ریلوے سٹیشن سے ہم باہر آئے تو کسی سے پوچھا کہ کشمور کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ بتایا گیا کہ اڈہ سے ایک بس پکڑو جو آپ کو ”کندکوٹ“ سے آگے کشمور پہنچائے گی۔ چنانچہ ہم بذریعہ بس شکارپور سے کندکوٹ پہنچے۔ کندکوٹ تو پہنچ گئے لیکن اس کے لیے کافی دیر لگا دی گئی بس بہت آہستہ چل رہی تھی۔ کندکوٹ ڈرائیور نے روٹی کھائی اور ہوٹل کی چارپائی پر ہی سو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ کہ ڈرائیور صاحب تو سو گئے ہیں اور سفر ابھی باقی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ ان کا یہاں پر ایک گھنٹے کا پڑاؤ ہے۔ بس پھر کیا تھا ہم بھی ادھر اُدھر چلتے پھرتے رہے کبھی بیٹھتے کبھی اُٹھتے وہ گھنٹہ پورا ہوا تو ڈرائیور صاحب نے سفر پھر شروع کیا۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ شکارپور سے کشمور کتنے میل کی دوری پر ہے تو بتایا گیا کہ تقریباً نوے میل دور ہے۔ لیکن ہم چھ سات گھنٹوں سے سفر میں تھے اور منزل مقصود ابھی دور تھی رات کو کہیں ہم کشمور اور پھر وہاں سے تھوڑی دور اس کالونی میں پہنچے جہاں پر وہ سکول تھا جس کے لیے مجھے بطور پرنسپل چنا گیا تھا۔ ہم نے سوشل ویلفیئر آفیسر کو اطلاع کر دی تھی کہ ہم فلاں دن کشمور کالونی نمبر 1 پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ ایک سندھی ٹیچر ہمیں اس کالونی میں جو ہمارا انتظار کر رہا تھا ملا اور اپنے گھر لے گیا۔ جہاں ہم نے رات آرام کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور صبح میرا دوست تو کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے سکول میں کام شروع کر دیا۔

یہ سکول ایک خوبصورت عمارت میں تھا۔ جس میں مرد اور خواتین دونوں بطور ٹیچر کام کرتے تھے۔ اور اس سکول میں زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس کے انجینئر جو کہ گڈو بیراج بنانے کے لیے آئے ہوئے تھے اُن کے ہی تھے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی انجینئر اور ایس۔ ڈی۔ او وغیرہ اور دوسرا جو سٹاف تھا اُن کے بچے بھی پڑھتے تھے۔ یہ سکول پانچویں جماعت تک کا تھا اور جس کے بعد اُنہیں کیا کرنا تھا اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔

مجھے ایک بہت بڑا کوارٹر کالونی میں ہی دے دیا گیا تھا۔ میں کچھ دن وہاں اکیلا رہا تو مجھے احساس ہوا کہ اس اجنبی ماحول کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنے بچے اور بیوی کو لے آؤں۔ اجنبی ماحول، کوئی ہم مزاج آدمی وہاں مجھے نہ ملا اور علاقہ بھی کچھ ایسا تھا کہ دل خوش نہ تھا۔ بس سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ ویسے بھی مجھے بچے پڑھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ چند دنوں میں جن لوگوں سے بھی میری ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے مایوس ہی کیا کہ اُن دنوں بھی لوگ پاکستان کے انجینئرز، ایس۔ ڈی او اور دوسرے ایسے تمام سٹاف کے بارے میں کرپشن کی ہی باتیں کرتے تھے۔ ایسی باتیں سن کر طبیعت بیزار سی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ واپس آیا، بیوی اور ساجد بیٹے کو ساتھ لے کر دوبارہ کشمور اور کوارٹر میں رہائش اختیار کر لی۔ سکول ٹائم کے بعد کوئی ایسی صورت نہ تھی کہ دن آرام سے گزر جائے۔ بس میاں بیوی اور بچے کے ساتھ ہی وقت گزرتا گیا لیکن ایک دن اچانک چھوٹا بھائی نصیر جو شاید پیدا ہی سفر کے لیے ہوا ہے کشمور میرے پاس آ گیا۔ میں حیران ہو گیا۔ کہ تم کیسے اکیلے یہاں آ نکلے ہو۔ کہنے لگا کہ یہ کون سا مشکل کام تھا۔ بس جی چاہا تو آ گیا۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق تو ہوئی لیکن طبیعت بیزار ہی رہی۔

پھر یہ بھی ہوا کہ نصیر صاحب کا ایک سندھی نوکر جو کہ ساتھ والے کوارٹر میں سٹور کیپر تھا جس کا تعلق جڑانوالہ سے تھا اور ہمارا اُن کے ہاں آنا جانا بھی تھا کے ہاں کام کرتا تھا اُس سے جھگڑا ہوا۔ دو چار سندھی لڑکوں نے نصیر صاحب کو اچھا خاصا مارا پیٹا۔ وہ اچانک عجیب حال میں کہ کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور جسم پر زخموں کے نشان بھی تھے میرے پاس سکول آ گیا۔ میں اسے ساتھ لے کر کشمور تھانے گیا اور پولیس کے ذریعے اس سندھی کو تھانے بلوا لیا۔ اس سندھی نے کشمور کے ایک ہندو کو بطور سفارشی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ نصیر بضد تھا کہ سندھی پر مقدمہ دائر کیا جائے اور اسے زیادتی کی سزا دی جائے۔ تھانیدار پنجابی تھا اور وہ مجھے علیحدگی میں لے گیا اور اس نے مجھے سمجھایا کہ اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔ میں اس سندھی کو جوتے لگا کر اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں اور یہ بضد ہے کہ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی جائے۔ شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ واقعہ 15-07 کا بنتا ہے اور اس دفعہ کے تحت آپ دونوں بھائی بھی اندر ہو سکتے ہیں اور یہ سندھی بھی۔ یہ سندھی تو ضمانت پر رہا ہو جائے گا لیکن تم دونوں بھائیوں کی یہاں پر ضمانت کون دے گا۔ میں نے نصیر کو سمجھایا۔ اس سندھی کو تھانے دار نے چند جوتے رسید کیے اور کہا کہ زمین پر ناک سے لکیریں کھینچ کر معافی مانگو۔ یہ سب اس نے کر دیا تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سندھی کو چھوڑ دیا گیا اور ہم دونوں بھائی واپس گھر آ گئے۔ میری بیوی کو بھی اس بات کا علم ہو چکا تھا وہ تمام دن پریشان رہی اور کہتی رہی کہ یہ آپ کہاں مجھے لے کر آ گئے ہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اب یہ سیشن تو پورا کرنا ہے امتحان ہوگا تو چھٹیوں میں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں نے کوئی ساری عمر یہیں یہ نوکری تو نہیں کرنی۔

سوئی کی سیر:

سیشن ختم ہو گیا۔ امتحان کا رزلٹ بھی تیار ہو گیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ایک تفریحی ٹرپ کا پروگرام بنایا گیا کہ بچوں اور بچیوں کے ساتھ سکول کی طرف سے سوئی کی سیر کی جائے۔ چنانچہ میں اور چند سکول ٹیچر سکول کے تمام بچوں کے ساتھ سوئی گئے جہاں سے گیس پہلی دفعہ نکلی تھی۔ یہ بڑی اچھی جگہ تھی بلکہ اسے اچھا بنایا گیا تھا تاکہ ملازمین کا اس جنگل میں دل لگا رہے۔ یہاں پر جو سٹاف بھی تھا انہیں بڑی اچھی رہائش دی گئی۔ ہر قسم کی سبزی ترکاری سکھر سے بذریعہ جہاز یہاں پر آتی تھی۔ اور اگر کسی سٹاف کے رکن کو چھٹی پر گھر جانا ہوتا تو بذریعہ جہاز اسے روہڑی پہنچانے کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ہر طرف اچھے مکان اور اچھی کوٹھیاں تھیں اور تنخواہیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ میں نے سوئی میں ایک بڑے افسر سے ملاقات کر کے مزید معلومات حاصل کیں۔ پوچھا کہ یہ سوئی گیس کس مقدار میں یہاں سے نکلتی ہے اور ہمارے ایندھن کی ضروریات کو کتنی مدت تک کام دے سکتی ہے؟

اس نے کہا کہ اگر پاکستان میں تمام ضروریات کو اس گیس سے پورا کیا جائے تو یہاں سے نکلنے والی گیس پاکستان کی تمام ایندھن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ستر سال تک کافی ہے۔

اس نے بتایا کہ جب گیس کو کنویں سے نکالا جاتا ہے تو اس میں گیس کے ساتھ کچھ مادہ قسم کی چیز بھی ہوتی ہے جسے ہم پیوری فیکیشن پلانٹ کے ذریعے گیس سے علیحدہ کر دیتے ہیں تاکہ پائپ لائن میں صرف صاف گیس ہی جائے اگر یہ گیس کے ساتھ رہ جائے تو پائپ لائن کو بھی تباہ کر دے اور جہاں جائے وہاں استعمال کرتے ہوئے بھی حادثے کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ سب سے اہم کام ہے جس کے لیے ہمیں بڑی توجہ کرنی پڑتی ہے۔ سوئی کا مقام بلوچستان میں ہے اور علاقہ بڑا عجیب و غریب سا جنگل ہے۔ جنگل زمین کا رنگ بھی قدرے سرخ تھا اور اردگرد کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ سوئی کشمور سے جانب شمال کوئی چالیس پچاس میل کا فاصلے پر ہے۔ بہرحال صبح سے لے کر رات تک ہم سوئی میں ہی رہے اور رات کو واپس اپنی کالونی میں آ گئے۔

سکول امتحان کے بعد پندرہ چھٹیوں کے لیے بند کر دیا گیا۔ نصیر تو واپس چلا گیا تھا اور ہم دونوں میاں بیوی کشمور سے روہڑی اور روہڑی سے کراچی آ گئے اور پھر اس کے بعد کشمور نہیں گئے اس طرح یہ نوکری بھی خود بخود ختم ہو گئی۔

کراچی میں چند دن اور پھر واپسی:

کراچی میں، میں نے اپنے دوست مشتاق نسیم دہرہ جو کہ شیخ برادری سے تھے اور میرے انتہائی اچھے دوستوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شمار ہوتے تھے۔ خاندانی مراسم بھی اُن کے ساتھ تھے کے گھر ہی قیام کیا جو اس وقت ناظم آباد میں رہائش پذیر تھے۔ میں نے چونکہ خط کے ذریعے اسے اطلاع دے دی تھی اس لیے وہ کراچی ریلوے سٹیشن پر آئے اور ہمیں سٹیشن سے اپنے گھر لے گئے۔ کوئی ایک ہفتے تک ہم نے کراچی کی خوب سیر کی۔ کراچی میں میرے اپنے عزیز بھی رہتے تھے کچھ وقت اُن کہاں بھی ٹھہرے۔ میری چھوٹی بہن اور بہنوئی مختار کا وہاں اچھا خاص کاروبار تھا۔ اور پھر میرے چچا کے بیٹے رشید صاحب بھی وہیں نوکری کررہے تھے اور میرے دوسرے چچا عبدالعزیز بھی کراچی میں تھے۔ ان سب کے گھر آنا جانا رہا تو وقت اچھا گزر گیا۔

کراچی، میں اپنی زندگی میں کئی مرتبہ گیا ہوں اور یہ میرا جانا دوسری مرتبہ تھا۔ پہلی مرتبہ 1954ء میں پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے ساتھ گیا تھا کہ کراچی میں انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ میں شرکت کرنا تھی۔ اس وقت کراچی کشمیر ہوٹل جو سٹی سٹیشن کے ساتھ تھا میں قیام پذیر ہوئے۔ اور تقریباً بیس پچیس روز تک اس ہوٹل میں ٹھہرے رہے۔ اسی قیام کے دوران منیر ڈار اور ذکاء الدین کے ساتھ دوستانہ ہوا۔ جو بعد میں پاکستان ہاکی ٹیم میں کافی مدت تک کھیلتے رہے اور بین الاقوامی سطح پر انہوں نے بطور ہاکی کھلاڑی نام کمایا۔ منیر ڈار سے تو بعد میں خصوصی تعلق رہا۔ اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ بڑا ہنس مکھ تھا۔ ہمیں اپنی عجیب وغریب باتوں سے محظوظ کرتا اور ہم انتہائی دل چسپی کے ساتھ اس کی باتیں سن کو خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کھلاڑی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جس سال اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اسی سال یہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ٹیم میں شامل ہوا، اسی سال یہ پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا رکن منتخب ہوا۔ اسی سال یہ پاکستان ریلوے کی ٹیم کے رکن کی حیثیت سے چن لیا گیا اور اسی سال یہ پاکستان ہاکی ٹیم کے لیے چنا گیا۔ بطور فل بیک ہاکی کی تاریخ میں منیر ڈار ایک بہت بڑا نام ہے۔ اس طرح ذکاء الدین نے بھی پاکستان ہاکی ٹیم میں شمولیت کے بعد بطور ان سائیڈ رائٹ ایک نمایاں حیثیت اختیار کر لی۔ بعد میں بطور منیجر پاکستان ہاکی ٹیم کے ساتھ وہ اکثر دوسرے ممالک میں پاکستان ہاکی ٹیم کے ساتھ بھی جاتے رہے۔ پہلے یہ دونوں کھلاڑی ریلوے میں ملازم ہوئے تھے بعد میں پولیس میں بھرتی ہوگئے۔ ذکاء الدین کا بنیادی تعلق اسلامیہ کالج لاہور سے تھا۔ جہاں سے اس نے ہاکی کھیلنا شروع کی۔ کراچی سے جب واپس آئے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا کہ نوکری کی تلاش جس کے لیے ذریعہ پھر ''پاکستان ٹائمز'' ہی تھا۔ لیکن اس دفعہ کوئی جلدی کام بنتا نظر نہ آیا بہرحال کوششیں جاری رکھیں۔

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے آخری ملاقات:

یہ غالباً 1959ء کا سن تھا کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے بڑے بیٹے مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری کے نکاح کے سلسلے (لائل پور) میں فیصل آباد آئے۔ میں ان دنوں فیصل آباد اپنے گھر والوں کے ساتھ مقیم تھا۔ میں نے بھی جامع مسجد کچہری بازار میں اس نکاح کی مقدس تقریب میں شرکت کی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی باقر صغیر احمد کے ساتھ مسجد کے اس دروازے جس کے ساتھ مدرسہ اشاعت العلوم کا دفتر ہے داخل ہوا تو شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے باہر صحن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تشریف فرما تھے۔ کسی کو کہہ رہے تھے کہ اس مٹی کے لوٹے میں میرے لیے پانی لاؤ کہ اچانک اُن کی نظر ہم دونوں بھائیوں پر پڑی تو اس آدمی سے کہا: ’’رہنے دو بھائی میرے اپنے بیٹے آ گئے ہیں۔‘‘ باقر صاحب تو پانی لینے چلے گئے اور میں آپ کے پاس بیٹھ گیا، سلام کیا اور پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ اُن دنوں اُن کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ بیماری کا غلبہ کسی حد تک زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر فرمانے لگے: ’’تمہیں میری صحت سے کیا، تم کون ہوتے ہو میری صحت کے بارے میں پوچھنے والے؟ میری یہ حالت ہو رہی ہے اور کبھی تم نے تین پیسے کا خط بھی لکھا ہے کہ تیرے ابا کا کیا حال ہے؟‘‘

یہ فقرہ ان کے لبوں سے میرے کانوں تک پہنچا تو میری حالت عجیب و غریب ہو گئی۔ میں انتہائی عجیب کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ اتنا بڑا آدمی مجھ ناچیز کے خط کا انتظار کرتا رہا اور میں تو ان کے اور اپنے درمیان جو ایک فرق تھا اس کے پیش نظر خط لکھنے کی جراءت ہی نہیں کر سکا مگر میں کیا سوچتا رہا اور وہ کیا سوچتے رہے۔ ایک دفعہ تو میرے پاؤں سے زمین نکل گئی لیکن سوچا کہ شاہ جی کو اس کا کیا جواب دوں۔ بالآخر میرے منہ سے یہی نکل سکا کہ شاہ جی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے مجھے اللہ کے لیے معاف فرما دیں۔ بس میں نے اتنا کہا تو مجھے پیار کیا اور فرمایا نہیں بیٹا ایسی بھی کوئی بات نہیں گلہ تھا، گلہ شکوہ بھی تو وہیں ہوتا ہے جہاں تعلق ہو۔ اور یہ اُن کی بڑائی ایک بڑی دلیل ہے۔ پھر نکاح کے اجتماع میں نکاح کے بعد جب آپ مائیک پر دعا کے لیے تشریف لائے تو سامعین کا ایک بڑا مجمع ان کے سامنے تھا۔ ہر طرف سے ایک ہی آواز آ رہی تھی کہ شاہ جی تقریر، شاہ جی تقریر۔ شاہ جی کچھ دیر تک تو خاموش رہے پھر فرمایا:

’’نہیں بھائی بہت ہو چکی ہیں تقریریں، اب کوئی حسرت باقی نہیں ہے۔ میں تو یہاں اپنے بیٹے کے نکاح کے لیے آیا ہوں اور دعا کے لیے کھڑا ہوا ہوں، آپ بھی میری دعا میں شامل ہوں کہ ہم دونوں خاندانوں کی اس نکاح کے بعد خوب نبھ سکے۔ اور اللہ ان میاں بیوی کو ایک اچھی اور دینی حوالے سے منفرد زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔‘‘

اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ پھر تقاضا ہوا کہ کچھ تو فرمائیں؟

بس پھر انہوں نے اپنی زندگی کی مختصر ترین تقریر کی۔ ان دنوں مصر کے جنرل ناصر کا بڑا چرچا تھا۔ جس نے انگریزوں سے نہر سویز چھین لی اور شاہ فاروق کے خلاف بغاوت کر کے اسے اس منصب سے معزول کر دیا تھا۔ برطانیہ کی فوجیں بھی میدان میں آئیں لیکن سویز پر جنرل ناصر کا قبضہ رہا۔ اور انگریزوں کو نہر سویز جو کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان تجارت کا واحد اہم ذریعہ تھا کو چھوڑنا پڑا۔ تقریر کیا تھی بس ایک آدھ ہی فقرہ تھا:

’’ہاں اب بھی میرے دل میں ایک اُمنگ سی اٹھتی ہے کہ خدا مجھے توفیق دے تو میں اپنے یار جنرل ناصر کے قصیدے پڑھوں، جس نے انگریزوں کو جوتے مار مار کر سویز سے بھگا دیا ہے۔‘‘

اس حال میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کی شدت اسی طرح بحال تھی۔ یہ تھی اُن کی وہ مختصر تقریر جو میں نے اس وقت سنی کہ جس کے بعد نہ انہیں دیکھ سکا اور نہ ہی ان سے کچھ سن سکا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ جی جب مسجد سے واپس جانے لگے تو دروازے سے نکلنے سے پہلے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ایک طرف مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری تو دوسری طرف میں بالکل ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ دروازے پر اس لیے رک گئے کہ سامنے اُن کے جمِ غفیر تھا جو محض ان کے دیدار کے لیے اس راستے پر کھڑا تھا جس راستے سے انہوں نے گزرنا تھا۔ اس وقت انہوں نے اپنے بیٹے کو جو کچھ کہا وہ میرے ذہن میں ریکارڈ ہے جو سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے:

”حافظ جی یہ جمِ غفیر دیکھ رہے ہو، یہ میرے لیے اپنی نظریں فرشِ راہ کیے ہوئے ہیں آخر کیوں؟ میں تو ایک فقیر ہوں، دوسرے وقت کی روٹی پر بھی قادر نہیں ہوں۔ یہ میرے پاس کیا لینے آجاتے ہیں۔ یہ سب لوگ مخلص ہیں۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے میری بات کو سنتے ہیں۔ واللہ باللہ میں نے جب بھی انہیں دین کے لیے پکارا یہ سر پہ کفن باندھ کے میری آواز پر گھروں سے نکل پڑے۔

بیٹے! لوگ مرنے سے پہلے بیٹوں کے لیے بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ میری جائیداد یہی لوگ ہیں جنہیں میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اگر تمہارا رویّہ اِن کے ساتھ محبت والا رہا تو ان شاء اللہ یہ لوگ دین کے لیے تمہارے کام بھی آئیں گے۔“

کیا خوب بات ہے۔ کوئی دوسرا مجھے تو نظر نہیں آیا جو یہ بات اپنے بیٹے کو کہے اور پھر بیٹے نے بھی اپنے باپ کی اس نصیحت کی لاج رکھی۔ انہوں نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دین کے لیے جو کچھ کیا، لوگوں کی ہر ممکن مدد اس میں شامل رہی۔

شاہ جی پھر دروازے سے نیچے اتر کر لوگوں میں گم ہو گئے اور میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ کچھ دور تک یہ اجتماع چلتا رہا کہ کچہری بازار میں وہ ایک کار میں سوار ہو کر میری نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر انہیں کبھی نہ دیکھ سکا۔

کار گاہِ فکر میں تیرے تصور کو ثبات
بن گیا تیرا جنوں میرا اثاثۂ حیات
تیرے لفظوں کی روانی آبشاروں کا بہاؤ
یاد آتا ہے مجھے تیری خطابت کا رچاؤ
تو ہے روشن استعارہ نطق کے اعجاز کا
قلب کو گرما گیا شعلہ تیری آواز کا

(جاری ہے)

☆......☆......☆

© rasailojaraid.com